The Harf-e- Raaz

By

Orya Maqbool Jan

January 2015

These articles were published in
EXPRESS NEWS PAPER
(http://www.express.com.pk)
Also available on http://www.oryamaqbooljan.com
http://oryamaqbool.blogspot.com

پرچم اتار دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فاتح اقوام کے سب سے بڑے اتحاد اور دنیا کی طاقتور ترین فوجی قوتوں کا پرچم۔ وہ قوتیں جو آج سے تیرہ سال قبل دھاڑتی، چنگھاڑتی ہوئی اس کمزور، وسائل اور ٹیکنالوجی سے محروم ملک، افغانستان میں داخل ہوئی تھیں۔ دنیا بھر کے لیے ایک لکیر کھینچ دی گئی تھی کہ اگر تم ہمارے ساتھ اس کمزور ملک سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر ہمارے دشمن ہو۔ 2001ء کی سردیاں اس ملک کیلئے عذاب کی صورت بنا دی گئیں۔ دنیا بھر میں سے تین ملک ایسے تھے جو اس ملک پر برسر اقتدار طالبان کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ جن میں سے ایک پڑوسی پاکستان بھی تھا۔ باقی پڑوسی ایران اور تاجکستان تو ویسے ہی ان کے خلاف شمالی اتحاد کو ہر طرح کی مدد دیتے ہوئے جنگ میں شریک تھے۔ لیکن جس پڑوسی نے انہیں ایک قانونی حکومت تسلیم کیا تھا، اسی پڑوسی کی سرزمین ان پر حملے کے لیے استعمال ہوئی۔ دنیا نے اس ملک کو دہشت گردی کا منبع قرار دیا اور پھر دو سو کے قریب ممالک میں سے اڑتالیس ممالک نے اپنی فوجیں وہاں اتار دیں۔ دشمن پڑوسیوں میں گھرا ہوا یہ ملک، ایک جانب پاکستان جہاں سے 57 ہزار دفعہ امریکی جہاز اڑے اور انہوں نے اس سرزمین پر بم برسائے، دوسری جانب تاجکستان جس نے قلاب والا زمینی راستہ دیا تاکہ نیٹو افواج شمالی اتحاد کے جلو میں اندر داخل ہو سکیں اور تیسری جانب ایران جس کے پاسداران شمالی اتحاد اور حزب وحدت کے ساتھ اس ملک پر چڑھ دوڑے۔ تیرہ سال قبل اس دنیا میں ٹیکنالوجی کے بت کی پرستش کرنے والے کیسی کیسی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ پہلے چند ماہ تو ایسے تھے کہ ہر کوئی بلند آواز میں پکار رہا تھا، دیکھو ٹیکنالوجی نے آج اُس قوم کو شکست دے دی ہے جس سے کوئی نہ جیت سکا۔ کوئی ان کے بھاگنے کے قصے سناتا اور کوئی کہتا کہ یہ تو چند ہزار لوگ تھے جنہیں کچھ طاقتوں نے اکٹھا کیا تھا، وہ پیچھے ہٹ گئیں تو دیکھو کیسے بھگوڑے ہو گئے ہیں یہ سب کے سب۔ اب افغانستان میں ایسے لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ یہ اب دوبارہ واپس نہیں آسکتے۔ اس کے بعد کے تیرہ سال آگ اور خون کے ساتھ کھیلتے ہوئے سال ہیں۔ ایک لاکھ چالیس ہزار فوجی جو دنیا کی بہترین ٹیکنالوجی سے لیس ہتھیاروں کے ساتھ یہاں خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ ایسے ٹینک جو اپنے اندر سے ایک ایسے مقناطیسی ردعمل کا دائرہ بنا سکتے تھے جن سے میزائل بھی واپس لوٹ جاتا تھا۔ آسمانوں سے پہرہ دیتے جہاز۔ فضا کی بلندیوں پر موجود ایک ایک لمحے کو ریکارڈ کرتے اور معلومات فراہم کرتے سٹلائٹ۔ ان سب کے باوجود کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ جب نیٹو افواج یا ان کی بنائی ہوئی افغان فوج نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ ہمارا پورے افغانستان پر کنٹرول ہو گیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ سوائے چند شہروں کے چند میل علاقوں کے پورے افغانستان میں امریکی یا نیٹو افواج کو کسی قسم کی کوئی دسترس تک حاصل نہ تھی۔ آخری سال تو شکست کے بدترین سالوں میں سے ایک تھا۔ یکم جنوری 2014ء سے 31 دسمبر تک 9167 افراد اس جنگ کا شکار ہوئے۔ جن میں 3,188 ایسے تھے جو اس بری طرح زخمی ہوئے کہ ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ بوکھلاہٹ میں الزامات حقانی نیٹ ورک پر لگائے گئے جس کے خلاف اس دوران شمالی وزیرستان میں آپریشن جاری تھا۔ کون ٹیکنالوجی کی شکست مانتا ہے اور وہ بھی نہتے افغانوں کے ہاتھوں جن کا سارا تکیہ ہی تائید الٰہی پر تھا۔ کیا کبھی امریکہ اور نیٹو کے اتحادیوں نے سوچا بھی ہو گا کہ اسقدر عظیم فوجی قوت کے باوجود ان کے تین ہزار چار سو اٹھاسی 3488 سپاہی مارے جائیں گے۔ یہ وہ گنتی ہے جو وہ خود مانتے ہیں۔ جب سے سی آئی اے بنی ہے اس کے نوے کے قریب اہم ایجنٹ مختلف ممالک میں مارے گئے ہیں، جن میں سے گیارہ اس افغان جنگ میں قتل ہوئے۔ افغانستان ایک ایسا ڈراؤنا خواب تھا جس کے اختتام کی تقریب 28 دسمبر کو منعقد ہوئی۔ نیٹو افواج کے کمانڈر جنرل جان ایف کیمپبل (JohF.Campbell) نے کہا "ہم اپنا طالبان کے خلاف جنگ کا ایجنڈا دھورا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن ہم بھاگ نہیں رہے"۔ کیا خوبصورت فقرہ ہے ("away Wearenotwalking") یہ تسلی افغان قوم کو نہیں بلکہ اس افغان حکومت کو دی جا رہی جسے امریکیوں نے خود وہاں پر مسلط کیا ہے۔ جمہوری حکومت اور جمہوریت کے قیام کا کیا خوب تصور ہے کہ ایک ملک پر حملہ کرو، وہاں افواج اتارو، لوگوں کو قتل کرو، خود ایک آئین تحریر کرو، اپنی نگرانی میں الیکشن کراؤ اور بولو کہ ایسے زندگی گزارتے ہو تو ٹھیک ورنہ تمہیں دہشت گرد کہہ کر مار دیں گے۔ اسی لیئے اس "ٹوڈی" حکومت کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ہم بھاگ نہیں رہے۔ لیکن اس اتوار کو امریکی صدر اوبامہ نے اپنے تحریری بیان میں کہا ہے کہ "ہم نے ایک محتاط طریقے سے اس جنگ کا خاتمہ کیا ہے جبکہ افغانستان آج بھی ایک خطرناک علاقہ ہے"۔ اس ملک میں تین لاکھ پچاس ہزار افغان فوجیوں کو بھرتی کیا گیا ہے جن کی ٹریننگ کے لیے 12 ہزار نیٹو کے فوجی یہاں پر موجود رہیں گے۔ اس تقریب میں افغانستان کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر محمد حنیف اعتماد نے کہا کہ آپ ہمیں ایسے وقت میں چھوڑ کر جا رہے ہیں جس وقت ہم انتہائی مشکلات میں ہیں۔ ہمیں کبھی بھی نیٹو افواج کی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی آج ہے۔ جس وقت یہ تقریب ٹیلی ویژن پر نشر ہو رہی تھی تو اس دوران افغان افواج کے افسران کے انٹرویو بھی نشر کیے جا رہے تھے۔ یہ افسران کہتے تھے کہ تیرہ سالوں سے ہم ایک ایسی جنگ کے عادی ہو چکے ہیں جو نیٹو کی تکنیکی اور فوجی مدد کے بغیر لڑی ہی نہیں جا سکتی۔ ہمیں ہوائی جہازوں کی بمباری اور ٹینکوں کی یلغار میں آگے بڑھنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ہم ان کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل پاتے جبکہ ہمارے دشمن طالبان اس تمام تر ٹیکنالوجی سے بے نیاز جس طرف سے چاہیں ہم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اب جبکہ یہ سپورٹ (مدد) ختم ہو رہی ہے، ہم بہت مشکل میں ہوں گے۔

جھنڈا اتار دیا گیا۔ وہ فتح کرنے آئے تھے اور اپنے زخم چاٹتے رخصت ہوئے۔ یہ تیسری دفعہ ہو رہا ہے کہ عالمی طاقتوں کا غرور خاک میں مل رہا ہے۔ یکم جنوری 1842ء برطانوی افواج، وہ برطانیہ جس کی علمداری میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اس پر کابل میں حملہ ہوا۔ تقریباً سترہ ہزار فوجی تھے جن میں اکثر انڈین اور ایک رجمنٹ "44th" برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی ان سب کو غلزئی قبائل نے قتل کر دیا تھا اور ایک ڈاکٹر ولیم برائڈن کو زندہ چھوڑا تاکہ وہ جا کر اس عالمی طاقت کے کارپردازوں کو بتائے کہ افغان قوم کیا ہے اور آئندہ کابل کی طرف رخ مت کرنا۔ یہ ڈاکٹر گھوڑے پر سوار ہو کر 13 جنوری کو جلال آباد پہنچا اور برطانیہ کے چہرے پر عبرت کا نشان تحریر ہو گیا۔ دوسری دفعہ یہ پرچم عظیم کیمونسٹ ریاست سوویت یونین کا تھا جو 1988ء میں ایسے اترا کہ خود اپنی ریاست تک متحد نہ رکھ سکا۔ ٹیکنالوجی کے بت ٹوٹتے ہیں لیکن ان کی پوجا کرنے والے نئے بت تراش لیتے ہیں لیکن وہ جنہیں صرف اللہ کی نصرت اور تائید پر بھروسہ ہوتا ہے وہ بار بار ثابت کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اصل طاقت کا سرچشمہ تو صرف اللہ کی ذات ہے اقبال نے کہا تھا۔

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی تو ہندوستان پر مکمل قبضے کے خواب نے تمام ہندو راجوں کو متحد کیا اور ان کا اقتدار پورے ہندوستان پر اس حد تک قائم ہو گیا کہ مغل بادشاہ شاہ عالم کے بارے میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی، "شاہ عالم۔ از دلی تا پالم"، پالم وہ جگہ ہے جہاں آجکل دلی ائرپورٹ ہے۔ ایسے میں شاہ ولی اللہ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی افغانستان کی سرزمین سے جانبازوں کے ہمراہ حملہ آور ہوا اور مرہٹوں کی شکل میں تمام ہندوؤں کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ہندوستان کو "ہندوتوا" بنانے کا خواب چکنا چور کرنے کے بعد واپس افغانستان چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پورے برصغیر میں مرکزیت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے علاقے کا بالادست حکمران بنتا چلا گیا۔ جس خطے میں سب سے زیادہ افراتفری تھی وہ پنجاب تھا۔ سکھ اکبر کے زمانے سے جتھوں کی صورت مسلح جدوجہد کر رہے تھے اور بہت حد تک گوریلا جنگ میں منظم ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں ہر علاقے، خاندان یا برادری کے حساب سے گروہ ترتیب پا چکے تھے جنہیں "مسل" کہا جاتا تھا۔ پورے پنجاب میں سکھوں کی بارہ مسلیں تھیں اور سب کی سب خود مختار بلکہ ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں۔ ان بارہ مسلوں میں سے ایک مسل گوجرانوالہ کے قریب آباد تھی جس کے سربراہ کے گھر 1780ء میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ سترہ سال کا ہوا تو باپ نے اسے دوسری مسلوں کے ساتھ جنگوں پر روانہ کرنا شروع کر دیا۔ صرف تین سال کے بعد یعنی بیس سال کی عمر میں وہ مسل کا سربراہ بن گیا۔ خوش قسمت اور ذہین شخص رنجیت سنگھ سربراہ بنتے ہی ایک بہت بڑی سلطنت کا خواب دیکھنے لگا۔ اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے اس نے پیش قدمی شروع کر دی اور پھر وہ ہریانہ سے ملتان، پشاور اور کشمیر تک کے علاقے کا طاقتور ترین حکمران بن گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ برصغیر کی تاریخ میں سکھوں کا وہ سردار جس نے ان کی سلطنت کی بنیاد رکھی جو پچاس سال تک قائم رہی۔

سکھوں کے اس عظیم حکمران کی ساری تربیت جنگ و جدل اور مار دھاڑ میں ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ہمراہ ایک برطانوی منظم فوج بھی لے کر آئی تھی۔ برطانیہ کی اس منظم فوج سے پہلے برصغیر میں مختلف لوگوں کو پانچ ہزاری یا دس ہزاری منصب دیئے جاتے تھے، جو جنگ کے وقت اپنے منصب کے مطابق افراد فراہم کرتے تھے۔ باقاعدہ منظم فوج کا کوئی رواج نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کو بہت شوق تھا کہ اس کی بھی ایک ایسی ہی ماڈرن اور منظم فوج ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے فرانس اور اٹلی سے فوجی نظم و ضبط کے ماہر چار جرنیل (1) ونچورا (Vanchoora)، (2) الارڈ (Allard)، (3) ایوی ٹیبل (Avitabile) اور (4) آگسٹ کورٹ (August Court) بلوائے۔ انہوں نے سکھوں کی ایک فوج منظم کی جسے خالصہ فوج کہا جاتا تھا اور اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور سے چند کلومیٹر دور شالامار باغ کے قریب اس جگہ تھا جسے "بدھو کا آوا" کہتے تھے۔ فوج کو منظم کرنے اور اسی پر اپنی حکمرانی کی مکمل بنیاد رکھتے ہوئے وہ یہ بھول گیا کہ رعایا کے چلانے کے لیے ایک اچھی انتظامیہ اور عدلیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک مملکت میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کا حل فوج کا استعمال کر کے نکالا جا سکتا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے انتظامی امور کے لیے بھی فوج کو بھیجتا۔ مالیہ وصول کرنا ہو، کہیں ڈکیتی ہو جائے۔ قبائلی تصادم ہو، ہر جگہ فوجی افسران جاتے اور معاملات سنبھالتے۔ انصاف کے لیے کوئی منظم نظام نہیں تھا بلکہ جگہ جگہ فوجی عدالتیں لگتیں اور فوری طور پر انصاف فراہم کر دیا جاتا۔ 1811ء میں جب یہ فوج ترتیب دی گئی تو اس کی تعداد صرف چار ہزار تھی جبکہ 1839ء تک یہ چالیس ہزار ہو گئی، جس کے ساتھ ایک لاکھ گھڑسوار دستے اور توپ خانہ بھی شامل تھا۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے فوجی عدالتیں اکثر لوگوں کو بھاری جرمانے کرتیں۔ چھوٹے سے چھوٹے جرم پر بھی جائیداد قرق کرنے کا حکم دے دیا جاتا۔ برصغیر کی تاریخ میں سب سے زیادہ مالیہ اسی دور میں وصول کیا گیا۔ یہ پیداوار کا چالیس فیصد تک تھا۔ ان یورپی جرنیلوں نے کٹر سکھ حکمران کو سیکولر حکومتی چہرہ بنانے کا درس دیا۔ اسی لیے 1831ء میں جب اس نے برطانوی گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ سے ملنے کیلئے اپنا وفد بھیجا تو اس میں ہری سنگھ نلوا (سکھ) فقیر عزیزالدین (مسلمان) اور دیوان موتی رام (ہندو) شامل تھے۔ لیکن خالصہ فوج کے اکثر سپاہی چونکہ سکھ تھے اس لیے ان کے انتظامی معاملات اور عدالتی فیصلے مسلمانوں کے خلاف بلکہ بعض دفعہ ان کے لیے ہتک آمیز ہوتے۔ فوج کو اپنے اس کردار نے یہ احساس دلا دیا کہ اصل میں وہی حکمران ہیں اور انہوں نے ملکی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ پر چونکہ اتفاق رائے تھا، اس لیے اس کے زمانے میں دخل اندازی زیادہ نہ ہو سکی۔

لیکن جب اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت پر بیٹھا تو سکھ دو بڑے سیاسی گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ڈوگرے اور سندھنا نوالے، سندھنا نوالہ گروپ کا سردار دھیان سنگھ فوج کے ہیڈ کوارٹر "بدھو کے آوے" میں گیا اور ان کو خفیہ اطلاع دی کہ کھڑک سنگھ پنجاب کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ پورے پنجاب میں ایک پراپیگنڈا مہم شروع کر دی گئی اور صرف تین ماہ بعد فوج نے کھڑک سنگھ کو غدار قرار دے کر تخت سے اتار دیا اور اس کے بیٹے نونہال سنگھ کو جو لڑکپن میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور فوج اُسے اپنا نمائندہ سمجھتی تھی، اُسے تخت پر بٹھا دیا۔ یوں سکھ فوج نے دو اختیار اپنے قبضے میں لے لیے۔ ایک مہاراجہ اور وزیر کی تقرری اور دوسرا یہ فیصلہ کرنا کہ غدار کون ہے اور محبِ وطن کون۔ لیکن ایک سال بعد ہی نونہال سنگھ ایک حادثے میں مارا گیا تو سندھنا نوالوں نے کھڑک سنگھ کی بیوہ چاند کور تخت پر بٹھا دیا۔

دھیان سنگھ کہاں چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کو ساتھ ملایا اور فوج کے ہیڈ کوارٹر "بدھو کے آوے" پہنچ گیا اور جرنیلوں نے شیر سنگھ کی حمایت کر دی۔ چاند کور کو اقتدار پر صرف دو ماہ ہوئے تھے کہ ستر ہزار فوج لاہور کے شہریوں پر ٹوٹ پڑی۔ کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ آخر شہریوں کی جانیں بچانے کے لیے چاند کور کو شیر سنگھ کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ شیر سنگھ نے تین سال حکومت کی، لیکن چونکہ اسے اقتدار فوج نے دلوایا تھا اس لیے اس کے سارے فیصلے فوج کے ہیڈ کوارٹر یعنی "بدھو کے آوے" میں ہونے لگے۔ جس کو قتل کرنا ہوتا اُسے انگریز کا ایجنٹ یا غدار کا لقب دینا کافی تھا۔ ڈوگرا گروپ فوج کی آشیرباد سے حکمران تھا اور سندھنا والے معتوب۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کو قتل کیا اور بدلے میں ہیرا سنگھ نے سندھنا والوں کے کئی افراد کو قتل کر دیا اور سیدھا فوج کے ہیڈ کوارٹر بدھو کے آوے پہنچ گیا اور عرض کی سندھنا والے غدار ہیں اور اگر اسے اقتدار دے دیا جاوے تو وہ سپاہی کی تنخواہ نو روپے سے بڑھا کر بارہ روپے اور گھڑسوار کی تیس روپے ماہوار کر دے گا۔ ایک بار پھر فوج لاہور پر حملہ آور ہو گئی۔ پوری رات توپ خانے سے گولہ باری کے بعد جب فوج صبح شہر میں داخل ہوئی تو لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور ہیرا سنگھ کو وزیر۔ ہیرا سنگھ نے فوج کی مراعات میں اضافہ کیا۔ ڈھائی روپے تنخواہ اور بڑھا دی، لیکن ایک دن جرنیل اس کے ایک مشیر سے ناراض ہو گئے اور اسے اقتدار سے علیحدہ کر کے گرفتار کرنا چاہا، مگر وہ بھاگ نکلا اور فوج نے اس کا تعاقب کر کے مار دیا اور اس کے ماموں جواہر سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا۔

اب بدھو کے آوے والوں کے مطالبات بہت بڑھ گئے۔ جواہر سنگھ نے سارا خزانہ بلکہ محل کے سونے کے برتن تک ڈھلوا کر کنٹھے بنوائے اور سکھ فوج میں تقسیم کر دیے، جو ٹیکس اکٹھا ہوتا خرچ کر دیا جاتا مگر مطالبات بڑھتے گئے آخر ایک دن جواہر سنگھ کو ہیڈ کوارٹر یعنی بدھو کے آوے میں طلب کیا گیا۔ اس کی بہن رانی جنداں اپنے بیٹے دلیپ سنگھ کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے آئی، مگر سکھ جرنیلوں نے بہن کے سامنے بھائی کو قتل کر دیا۔

اب نو سالہ دلیپ سنگھ حکمران تھا اور رانی جنداں سرپرست، لیکن کوئی بھی فوج کے ڈر سے وزیر نہیں بننا چاہتا تھا، جس کو کہا جاتا وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ جاتا۔ گلاب سنگھ اور تیج سنگھ جیسے "بدھو کے آوے" والوں کے وفادار بھی انجام سے ڈر کر بھاگ گئے۔ کمسن دلیپ سنگھ کو کچھ ناموں کی پرچیاں دی گئیں اور قرعہ نکال کر زبردستی لال سنگھ کو وزیر بنایا گیا۔

خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ توشہ خانہ کے برتن بھی بیچے جا چکے تھے، لیکن بدھو کے آوے میں بیٹھی خالصہ فوج کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے۔ رانی جنداں کے پاس بلیک میلنگ سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ خالصہ فوج کو انگریز کی فوج کے ساتھ لڑا دیا جائے۔ پراپیگنڈے کا وہ طریقہ جو خالصہ فوج استعمال کرتی تھی، اس نے بھی شروع کیا اور سرگوشیوں کو مہم چلائی کہ انگریز پنجاب پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ عام سپاہی کو انگریز کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لیے وہ مرنے مارنے پر تیار تھا، لیکن جرنیلوں کو اندازہ تھا اور وہ لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مخالفت کی، رانی جنداں نے پراپیگنڈا عام فوجیوں تک پھیلا دیا۔ اب بدھو کے آوے میں بیٹھے جرنیلوں کے لیے کوئی راستہ نہ تھا، "طاقتور" خالصہ فوج جب لڑنے نکلی تو عوام نے، جس کا انہوں نے پہلے ہی بھرکس نکال دیا تھا، ان کا ساتھ نہ دیا۔ شکست فاش ان کا مقدر بنی۔ سکھ حکمرانی کا دور تمام ہوا، اور ان کے پاس ماضی کو یاد کرنے کے لیے بس ایک نعرہ باقی رہ گیا "راج کرے گا خالصہ"۔۔۔

نوٹ: فیس بک پر میرا پیج www.facebook.com/oryamj۔ اس کے علاوہ میرا کسی بھی پیج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسلم امہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں دینی مدرسے کا تصور سب سے پہلے برصغیر میں انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1781ء میں کلکتہ مدرسہ کھول کر پیدا کیا۔ اس سے قبل بغداد کے دارالحکومت سے شروع ہونے والی مدارس کی تحریک جو 1100ء سے 1500ء تک طلیطلہ کے تراجم کی انتھک کوششوں سے ہم آہنگ ہو کر دنیا بھر کے علوم کی قائد بنی' اس کے زیر اثر قائم ہونے والے تمام مدارس علم میں کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سید الانبیاء ﷺ کی حدیث کے مصداق علم مومن کا گمشدہ مال تھا۔ اس امت کے تمام مدارس میں قرآن و سنت اور فقہ کے علاوہ جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں علم طب' علم الادویہ' علم ریاضی' علم طبیعات' علم فلکیات' فلکیاتی جدول' امراض عین' علم المناظر' علم کیمیا' علم فلسفہ' علم تاریخ' علم موسیقی اور دیگر کئی علوم شامل تھے۔ اس تصور کو برصغیر کے مسلم مدارس نے بھی انگریز کی آمد تک قائم رکھا۔ مدرسہ رحیمیہ اور مدرسہ فرنگی محل کے نصاب انہی علوم پر مبنی تھے۔ یہی تعلیمی ادارے تھے جس سے علم حاصل کر کے لوگ طبیب بنتے تھے اور گاؤں گاؤں جا کر حکمت اور طب کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ آج بھی ان گھرانوں میں علم طب اور علم الادویہ کی کتابوں کے وہ نسخے مل جائیں گے جو ان مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ انہی تعلیمی اداروں سے استاد پیدا ہوتے اور ہر گاؤں میں اتالیق مقرر ہوتے تھے۔ ایک ایسا غیر رسمی تعلیمی نظام پورے برصغیر پر رائج تھا جس کے نتیجے میں اس خطے میں شرح خواندگی 95 فیصد سے زیادہ تھی۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل G.W.Leitner جی ڈبلیو لائٹنر کی کتاب IndiginousEducationinPunjab اس بات کی گواہی ہے کہ مغلیہ دور میں ہر گاؤں کی سطح تک بنیادی تعلیم کا تصور کس قدر مستحکم تھا۔ شرح خواندگی یہ نہیں تھی کہ اپنا نام لکھ اور پڑھ سکتا ہو بلکہ ہر پڑھے لکھے شخص کو فارسی پڑھنا' لکھنا آتی تھی' حساب کتاب پر دسترس تھی اور اسے قرآن یا وید پڑھنا آتی تھی۔ یہ سب اساتذہ جو گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے تھے انہی مدارس سے پڑھ کر نکلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 1906ء کے تمام اضلاع کے گزٹیر اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ضلعوں میں عمومی شرح خواندگی 90 فیصد کے لگ بھگ نظر آئے گی۔ یہی حال 1911ء کی مردم شماری کی رپورٹ کا ہے۔ یہ تعلیم اور خواندگی کا جال انہی مدارس سے فارغ التحصیل افراد نے پھیلایا تھا۔ پورے برصغیر میں جو سول سروس تھی جس میں مالیہ وصول کرنے والے' زمین کی پیائش کرنے والے جریب کش' کوتوال' عدالتوں کے قاضی' خزانے کے متولی' عمارتیں تعمیر کرنے والے انجینئر جنہوں نے تاج محل اور شالیمار جیسے شاہکار تخلیق کئے' یہ سب کے سب انہی مدارس سے علم حاصل کر کے ان عہدوں تک پہنچتے تھے۔ ایک مربوط تعلیمی نظام کے بغیر یہ لوگ آسمان سے نازل نہیں ہوتے تھے۔ اس دور میں برصغیر میں آنے والے ہر سیاح نے صرف اور صرف ایک چیز کی بے حد تعریف کی ہے اور وہ تھی اس خطے میں عام آدمی کی زندگی میں علم اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور سیاسی امور کی اہمیت۔ 1643ء میں جو کتاب یورپ میں چھپ کر عام ہوئی وہ سر تھامس رو کا سفر نامہ تھا۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب آرکائیوز میں موجود ہے جس کی ورق گردانی آپ کو بتا دے گی کہ پورے ہندوستان میں ان تعلیمی اداروں کا کیسا جال بچھا ہوا تھا۔ صرف ٹھٹھہ جیسے دور دراز علاقے میں چار سو کالج قائم تھے۔ البتہ فرق ایک تھا اور وہ یہ کہ آج کے دور کی طرح امتحانات کے ذریعے پاس کرنے اور ڈگری دینے کا رواج نہ تھا۔ وہاں استاد اپنے شاگردوں کو روز پرکھتا تھا اور پھر ایک دن اعلان فرما دیتا تھا کہ اب میرا یہ شاگرد علم میں طاق ہو گیا ہے۔ چند بڑے بڑے سوالات یاد کر کے امتحان دے کر ڈگری حاصل نہیں کی جاتی تھی۔

1781ء میں کلکتہ مدرسہ قائم کرنے سے پہلے انگریز نے اس علاقے میں 1757ء سے مسلمانوں کے تمام تعلیمی اداروں پر پابندی لگا دی۔ اب وارن ہیسٹنگز نے اس "دینی مدرسے" کی بنیاد رکھی جسے صرف اور صرف دینی تعلیم کے لئے مختص کیا گیا۔ اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ کو اسی طرح کی ذمہ داریوں کا درس دیا گیا جیسا یورپ میں تحریک احیائے علوم کے بعد چرچ کے پادریوں کو دیا جاتا ہے یعنی پیدا ہونے پر بپتسما دے دو' شادی پر جوڑے کو قانونی حیثیت دے دو' مرنے کے بعد رسومات ادا کر دو اور اتوار کی عبادت کی قیادت کر لو۔ یہ چار ذمہ داریاں بالکل اسی نوعیت کے حساب سے برصغیر کے علماء کو سونپ دی گئیں اور مسلمانوں کے قدیم مدارس کی طرز پر عیسائی مشنری سکول کھولے گئے۔ 1810ء میں کلکتہ میں پہلا مشینری سکول کھلا جس کے نصاب میں بائبل کی اخلاقیات "BiblicalEthics" اور عیسائی تعلیم کے ساتھ تمام دنیاوی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور تمام سرکاری نوکریوں کے لئے انگریزی لازم قرار دے دی گئی۔ پورے ملک کے تمام تعلیمی اداروں سے قرآن و سنت خارج کر دیا گیا اور اسے اسلامیات کے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی کہ جو کوئی اس کو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ تعلیم صرف سکول اور کالج تک محدود ہو گئی اور اس کے بعد کے نوے سالوں میں وہ زوال آیا کہ 1947ء میں انگریز جب برصغیر کو چھوڑ کر گیا تو شرح خواندگی 14 فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ اس دور زوال میں مسلمان مدارس نے وہ ذمہ داری بخوشی قبول کر لی جو انگریز نے دی تھی اور ایک ایسی کھیپ تیار کرنا شروع کر دی جو کم از کم قرآن و سنت کے علم کو محفوظ رکھیں اور اسے کونے کونے تک پہنچائیں۔ مغربی تعلیم کی یلغار اور انگریز حکومت کے مقابلے میں اپنے دینی علم کا تحفظ ان مدارس کا بنیادی مقصد بن گیا اور جس لگن اور ایمانداری سے انہوں نے یہ فریضہ نبھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔

بلوچستان کے قمر دین کاریزیاب سیمہ جیسے دور افتادہ گاؤں ہوں' سندھ میں مٹھی اور ڈیپلو کے ریگستان ہوں' پنجاب میں بھکر' راجن پور یا میانوالی کا بے سرو سامان قصبہ ہو یا سرحد کی بلند چوٹی پر آباد کوئی بستی۔ پانی' بجلی' سیوریج' تعلیم' صحت اور دیگر سہولیات سے بے نیاز ان مدارس کا پڑھا ہوا ایک شخص صبح منہ اندھیرے مسجد کا دروازہ کھولتا ہے' صفیں درست کرتا ہے' چبوترے پر اذان دیتا ہے اور ان میں پانچ وقت نماز پڑھاتا ہے۔ اکثر جگہ اس کی گزر بسر صرف اور صرف لوگوں کے گھروں سے کھانا یا شادی اور موت کی رسومات پر نذرانے کے سوا کسی اور چیز پر منحصر نہیں ہوتی۔ پورے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ لوگ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کو زندہ رہنے کی واحد علامت ہیں۔ یہ اگر موجود نہ ہوں تو لوگ اذان دینے اور نماز پڑھانے والے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ ذمہ داری گزشتہ دو سو سال سے اس طرح نبھائی ہے کہ آج تک کسی مسجد کے دروازے پر تالہ نہیں لگا کہ مولوی ہڑتال پر ہے۔ کبھی کوئی نماز لیٹ نہیں ہوئی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اس ملک کے کوچے کوچے اور قریے قریے میں موجود ہیں۔ جہاں سرکار کا نام و نشان نہیں وہاں بھی موجود ہیں۔ کسی گاؤں میں چلے جائیں آپ کو سرکار کا ہسپتال ویران نظر آئے گا' وہاں کا سکول بے آباد ہو گا' نہ ڈاکٹر کا کہیں پتہ چلے گا اور نہ ہی استاد کا لیکن وہاں ایک ہی آباد اور روشن مقام ہو گا اور وہ اللہ کا گھر جس کی رکھوالی ایک مفلوک الحال درویش مولوی کر رہا ہوتا ہے۔ اس مولوی سے دشمنی کی اور کوئی وجہ نہیں' بس صرف ایک ہے کہ یہ اللہ کے نام کا دانستہ یا نادانستہ طور پر نمائندہ بن چکا ہے اور اپنا فرض نبھا رہا ہے۔ لیکن جب بھی میرے ملک کے "عظیم" دانشوروں کو موقع ہاتھ آتا ہے وہ ان مدارس کو سرکاری کنٹرول میں کرنے کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا ہے اس کے بعد کیا ہو گا۔ وہی جو تمام اداروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مولویوں کا تنخواہیں بڑھانے کے لئے اور دیگر مراعات کے لئے احتجاج شروع ہو گا' دھرنے' مساجد پر تالے اور درس و تدریس کا خاتمہ۔ وہی حال جو ہم نے اپنے باقی تمام محکموں کا کیا ہے۔ مجھے اپنے ان عظیم دانشوروں کی یہ منطق اچھی لگتی ہے کہ تمام مدارس کو سائنسی اور جدید علوم پڑھانے چاہئیں تاکہ روحانی اور مادی ترقی ساتھ ساتھ ہو لیکن کیا یہ منطق کالجوں یونیورسٹیوں اور اے لیول وغیرہ پر لاگو نہیں ہوتی کہ انہیں بھی قرآن و حدیث پڑھایا جائے تاکہ معاشرہ میں ایک ہی طرح کا نظام تعلیم اور ایک طرح کے انسان جنم لیں۔ ان اداروں میں تو جو تھوڑا بہت اسلام موجود ہے' یہ لوگ اس کو بھی نکالنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اصل مقصد صرف یہ ہے کہ تعلیم سے اللہ اور اس کے رسول کو دیس نکالا دے دو۔ اسے امن کی شرط کہا جا رہا ہے۔ یورپ نے 1900ء تک دین کو تعلیم سے نکال دیا تھا۔ کیا وہاں امن آ گیا؟ اس کے بعد اس نے دو عالمی جنگیں لڑیں اور کروڑوں انسانوں کا خون بہایا۔ شاید تاریخ کسی کو یاد نہیں یا وہ یاد کرنا نہیں چاہتا۔

فرانس کے شہر پیرس میں اظہارِ رائے کے تحفظ کے لیے ہونے والا ایک جہتی کا مظاہرہ ایک معمول کا واقعہ نہیں۔ یہ لوگ کسی سے یک جہتی کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ اس اتحاد کا آغاز ہے جس نے ایک دن پوری مسلم امت سے جنگ میں کودنا ہے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے حکمران پیرس کی سڑکوں پر ایسے مارچ کر رہے تھے جیسے آج سے چند صدیاں پیشتر یورپ کی گلیوں میں صلیبی جنگوں میں جانے والے رضاکار لوگوں کے جلوس پرجوش تالیوں میں شہروں کی گلی کوچوں میں گزرا کرتے تھے۔ کیا یہ سب کچھ آنے والے زمانوں کا پیش خیمہ ہے جس کی بشارت سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، فرمایا "پھر رومی اپنے بادشاہ سے کہیں گے کہ ہم عرب والوں کے لیے آپ کی جانب سے کافی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک عظیم جنگ کے لیے اکٹھے ہوں گے اور اسی (80) جھنڈوں کے تحت آئیں گے اور ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار سپاہی ہوں گے (مستدرک وصحیح ابن حب آن)۔ یہ جنگ کب برپا ہونی ہے، اس کا علم صرف اور صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ لیکن دنیا میں چھڑنے والی جنگوں کا آغاز اگر دیکھیں تو ان کے پس منظر میں آپ کو اسی طرح کے واقعات نظر آئیں گے۔ کوئی معمولی سا واقعہ جنگ کا بہانہ بنتا ہے اور جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جنگ کے بادل چھٹ جاتے ہیں، لاکھوں لوگ قتل ہو جاتے ہیں، ہزاروں گھر برباد اور شہر کھنڈر بن جاتے ہیں، کسی کے سینے پر فتح کا تمغہ سجتا ہے اور کسی کے سر پر ذلت کا تاج۔ اس سارے کھیل کے ختم ہونے کے بعد جب لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں، تو کہانیاں منظر عام پر آنے لگتی ہیں۔ یہ تو فلاں ملک کی سازش تھی، یہ آگ تو جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ یہ سب تو ایک جھوٹے پراپیگنڈے کی وجہ سے ہوا۔ اس جنگ سے تو فلاں نے اپنا مفاد حاصل کرنا تھا۔ پیرس کے ایک غیر مقبول جریدے کے قتل کیے جانے والے چند صحافیوں اور کارٹون بنانے والوں کو ایک ایسی تحریک کی شکل دینا جو پوری دنیا کو دو خیموں میں تقسیم کر دے، یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی گرد سے عالمی جنگ کے شعلے اٹھتے نظر آ رہے ہیں۔

1096ء میں شروع ہونے والی پہلی صلیبی جنگ میں حصہ لینے والے آج کے دور کے اتحادیوں کی طرح منافق نہیں تھے۔ انہوں نے آزادی اظہار، سیکولرزم اور جمہوریت کا لبادہ نہیں اوڑھا ہوا تھا۔ ستمبر 1096ء میں جب کاؤنٹ بوہمنڈ آف ٹیرانٹو نے نارمن صلیبی فوجیوں کو مارچ کرتے ہوئے دیکھا جو شہر کے بیچوں بیچ جلوس کی صورت جا رہے تھے تو اس نے اپنا سرخ لباس پھاڑ پھینکا، کیتھڈرل سے جا کر صلیب اٹھائی اور کہا، میں بھی "فرینک ہوں، اور کہا یہ میرے سب بھائی شہید ہو کر میرے بغیر ہی جنت میں چلے جائیں گے، اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ستمبر 1096ء سے لے کر 2 اکتوبر 1187ء تک، وہ دن جب صلاح الدین ایوبی فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوا، پورا یورپ اسی طرح جلوسوں کی صورت شہروں میں نکلتا اور اپنے صلیبی جنگجوؤں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتا۔ انہیں خوبصورت انداز سے محاذِ جنگ کے لیے رخصت کیا جاتا۔ یہ لوگ واضح تھے، اپنے مقصد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ 1099ء میں جب انہوں نے یروشلم فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کا قتل عام کیا، تو انہوں نے اس پر فتح کے شادیانے بجائے، کسی نے انسانی حقوق، نظام کی تبدیلی، آمریت سے نجات کے نعرے میں پناہ نہیں ڈھونڈی۔ صاف صاف کہا ہم تمہارے دشمن ہیں اور تم ہمارے دشمن ہو۔ لیکن آج تو امن اور اظہار رائے کی آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا ہے۔ یہ نعرہ اس پیرس میں لگایا گیا جہاں آج سے چند سال پہلے عدالت نے ایک ایسے اشتہار پر پابندی لگائی تھی، جس میں ماڈل حضرت عیسیٰ کے آخری کھانے (LastSupper) کی نقالی کر رہا ہوتا ہے۔ 2005ء میں عدالت نے ایک ادارے (AideshauteGaronne) کو اس لئے سزا سنائی کہ اس نے ایڈز کی روک تھام کے لیے ایک تقریب منعقد کی جس کے معلوماتی کتابچے پر ایک عیسائی راہبہ (Nun) کی ایسی تصویر تھی جس کے سکارف کے ساتھ دو گلابی کنڈوم لٹکے ہوئے تھے۔ 1994ء میں اسی فرانس کی ایک عدالت نے ایک اخبار (Lequotidiandeparis) کو مجرم قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسا مضمون چھپا تھا جس میں پوپ اور ان ریاستوں کے خلاف گفتگو کی گئی تھی جو کتی ھولک نظریات پر کاربند تھیں۔ خود یہ میگزین چارلی ہیبڈو اپنے ایک کارٹونسٹ کو صدر سرکوزی کی بیوی کے قابل اعتراض کارٹون بنانے پر نوکری سے بھی نکال چکا ہے اور معافی بھی مانگ چکا ہے۔ فرانس کا یہ صدر سرکوزی جب وہاں وزیر داخلہ ہوتا تھا، اس نے ایک رسالے پیرس میچ کے ڈائریکٹر کو نوکری سے اس لیے نکلوایا تھا کہ اس نے اسی کی بیوی سیسلیا کی نیویارک کے کسی آدمی کے ساتھ قابلِ اعتراض تصویریں شائع کی تھیں۔

لیکن یہاں مسئلہ آزادی اظہار کے تحفظ کا نہیں۔ اگر آزادی اظہار کا تحفظ یورپ کے ممالک کو اتنا ہی عزیز ہوتا تو کوئی وہاں یہودیوں، اسرائیل یا ہولوکوسٹ پر چند سطریں ہی لکھ کر دکھاتا۔ اخبار تو ایک منظم ادارہ ہے، آپ سوشل میڈیا پر چند سطریں لکھ کر دیکھیں کیسے آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے لیے بے تاب انتظامیہ آپ کا گلا گھونٹ دے گی۔ جہاں ایک بارہ سالہ بچے کو اس لیے سزا سنا دی گئی کہ اس نے ہٹلر کی تعریف اور یہودیوں کے خلاف بلاگ بنایا تھا۔ مسئلہ ابھی تو عالمی جذبات کی گرد میں لپٹا ہوا ہے۔ لیکن وہ جن کی زندگی جنگ و جدل اور سازشوں کے تانے بانے بنتے گزری ہے ان میں سے چند لوگ زبان کھول رہے ہیں کہ یہ سب کیوں برپا ہوا۔ پال کریگ رابرٹس (PaulCraigRoberts) جو صدر ریگن کے زمانے میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھا اور آج کل وال سٹریٹ جنرل کا ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں امریکہ اور اس کی سی آئی اے کو خوب جانتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ امریکہ نے نیٹو کے ممالک پر روس سے کاروباری تعلق رکھنے پر پابندی لگا رکھی ہے جس سے فرانس کی معیشت بری طرح خسارے کا شکار ہو رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانس کے صدر نے اس واقعہ کے چند دن پہلے اعلان کیا تھا کہ روس پر سے پابندیاں ہٹا دی جائیں گی۔ یہ فرانس کا امریکہ کی ان دیکھی غلامی سے آزادی کا اعلان تھا۔ لیکن چارلی ہیبڈو کے حق میں اظہار یک جہتی اسے ایک ایسی جنگ میں واپس گھسیٹ لائے گی جہاں اسکے لئے امریکہ کے اشاروں پر ناچنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ اسی لیے اس مارچ میں مسلمان ممالک سے بھی وہی سربراہان مملکت گئے ہیں جو امریکی اثر و رسوخ کے تحت ہیں یا پھر جن کی حکومتوں کی بقا امریکہ فوج اور سیاسی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ابھی تو قتل کی تحقیق کا آغاز ہے اور ابھی سے مقصد کا سراغ نظر آ رہا ہے۔ نیویارک ٹائمز اپنی اشاعت میں لکھتا ہے کہ ان کارٹونسٹ اور صحافیوں کا قتل دراصل شام اور عراق میں قائم خلافت اسلامیہ کے ایما پر ہوا ہے۔ وہ تین بندوق بردار جو پیرس کے واقعہ میں ملوث بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک احمدی کوبلی کی موت کے دو دن بعد وڈیو منظر عام پر لائی گئی ہے جس میں وہ خلافت اسلامیہ کے جھنڈے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کے سوالات اور جوابات پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس وڈیو میں وہ ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ اخبار پر حملے کرنے والے اور ہم سب ایک گروہ کا حصہ ہیں۔ کچھ کام ہم ساتھ کرتے ہیں اور کچھ علیحدہ علیحدہ، لیکن میں نے ابو بکر البغدادی کو اپنا امیر مانا ہوا ہے۔ جس دن صبح نیویارک ٹائمز میں یہ مضمون چھپا اسی شام کو امریکی سینیٹر جان میکین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر خلافت اسلامیہ کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکہ کا سب سے قابل اعتماد اور حکومتی پالیسیوں کا آئینہ دار رسالہ "فارن پالیسی" اس واقعے کے بعد ایسے مضامین شائع کر رہا ہے جن سے ایک نئی جنگ کے آغاز کی بو آ رہی ہے۔ یہ جنگ خوفناک بھی ہو سکتی ہے اور فیصلہ کن بھی۔ امریکہ کے بارے میں یہ رسالہ لکھتا ہے کہ پراپیگنڈہ کی جنگ میں بھی امریکہ خلافت اسلامیہ کو نہیں ہرا سکتا۔ اسلئے کہ مغرب کو علم تک نہیں کہ وہاں کا مذہب، ثقافت اور حالات کیا ہیں۔ اس کام کے لیے عرب ریاستوں اور مسلمانوں کو آگے آنا ہو گا۔ جنگ میں کودنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ دشمن کس قدر متحد ہے اور مسلمانوں کا اتحاد دیکھنا ہو تو ایک ہی ٹیسٹ ہے اور وہ یہ کہ امت ابھی تک وہ سیدالانبیاء کے نام پر اور اُن کی شان پر جان قربان کرنے کو تیار ہے یا نہیں۔ یہ وہ واحد محبت ہے جس میں کوئی فرقہ بندی اور مسلکی اختلاف نہیں۔ اسی لئے خاکے دوبارہ شائع کئے گئے ہیں تاکہ دیکھا جا سکے کہ اس امت میں غیرت کہاں تک باقی ہے۔ یہ صرف یک جہتی کا مظاہرہ نہیں، آنے والے خوفناک دنوں کا آغاز ہے۔

نوٹ: سود کے متبادل نظام پر بحث کے لیے تقریب آج 16 جنوری 2015ء، پنجابی انسٹیٹیوٹ، قذافی سٹیڈیم، لاہور میں تین بجے سہ پہر منعقد ہو گی۔ آپ کا انتظار رہے گا۔

صرف چند لمحوں کے لئے سوچیے

سرمائے کی ہوس اور اقتدار کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ وہ تمام ممالک جو اس وقت عراق اور شام میں قائم ہونے والی دولت اسلامیہ کے خلاف جنگ کے بنیادی ستون ہیں' جن کی سرحدیں اس نئی قائم ہونے والی ریاست کے ساتھ ہیں۔ ایک ایسی ریاست جسے دہشت گردی کی علامت اور دنیا بھر کی تہذیب کے لئے خطرہ قرار دیا جارہا ہے' یہی ممالک دولت اسلامیہ کے تیل کی فروخت میں سب سے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ دولت اسلامیہ نے جب عراق کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے اس تیل کو سستے داموں خریدنے کی ہوس ایرانی اور کُرد سمگلروں کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ صرف چند دن کے بعد 6 نومبر 2013ء کو تیل سے بھرے ہوئے ہزاروں ٹینکروں کی قطاریں ایران کی سرحد پر پرویز خان کے علاقے میں موجود تھیں۔ اس کے بعد کُرد حکومتی اہلکاروں' ایرانی سمگلروں اور ایرانی حکومت کے کسٹم حکام اور پاسداران میں نجانے کیا سمجھوتہ طے پایا کہ کئی دنوں سے رکے ہوئے ان ٹینکروں نے اپنی منزلوں کی جانب روانگی اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ آغاز کے ان دنوں میں دولت اسلامیہ کو روزانہ دس لاکھ ڈالر تیل کی فروخت سے ملتے تھے جن کی تعداد میں اب کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پہلا آئل ٹینکر جون کے وسط میں "توز فرماتو" کے شہر پہنچا تھا۔ یہ ایک ترک اور کُرد آبادی کا شہر ہے۔ یہاں اس ٹینکر کو سمگلروں نے خریدا اور پھر آگے روانہ کر دیا۔ شروع شروع میں یہ ٹینکر بہت کم تھے لیکن جیسے ہی تعداد بڑھی کُرد انتظامیہ نے پابندیاں لگانا شروع کر دیں۔ اب دولت اسلامیہ نے براہ راست سمگلروں کو تیل بیچنا شروع کر دیا' اب سمگلروں نے کُرد انتظامیہ سے رابطہ کیا' معاملات طے ہوئے' انتظامیہ نے خود تیل خریدنا شروع کیا اور پھر اسے اربیل اور سلیمانیہ میں موجود دو غیر لائسنس یافتہ ریفائنری پلانٹ میں صاف کر کے اس کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ تمام کاروبار حکومت نہیں کر رہی بلکہ حکومتی اہلکاروں کی اشیر باد سے ہو رہا ہے جس سے سمگلر اور بددیانت حکومتی اہلکار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہوس زر کا کوئی مذہب اور کوئی نسل نہیں ہوتی۔ یہ سمگلر کُرد ہو گا لیکن تیل کسی ترک سمگلر کو بیچنے میں نہیں ہچکچائے گا۔ تیل دولت اسلامیہ کا ہے لیکن خریدار سب کے سب اس کے مخالف' اس سے جنگ کرنے والے۔ پیش مرگہ کے وہ کُرد جنگجو جو دولت اسلامیہ کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہیں اور انہیں امریکہ اور مغرب کی مکمل حمایت حاصل ہے وہ بھی اس بہتے تیل کی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں اور ایران' اردن' شام کی حکومتیں بھی آنکھیں بند کر کے اس تیل کی ترسیل کو یقینی بنا رہی ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس تیل کو سمگل کرنے والوں کے نام پوری دنیا کو معلوم ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ دولت اسلامیہ کی معیشت کا دارومدار اسی تیل کی فروخت پر ہے۔ اس کے باوجود بھی دولت کمانے کی ہوس کسی بھی ملک کو یہ فروخت روکنے پر مجبور نہیں کر پاتی۔ کرکوک اربیل روڈ پر بے شمار چھوٹی چھوٹی ریفائنریز بن چکی ہیں جہاں یہ تیل پہنچتا ہے اور پھر آگے سمگل ہوتا ہے۔ سلیمانیہ کا باقی یسین اس سارے کاروبار کا بادشاہ تصور ہوتا ہے۔ اس کے گروہ میں کُرد اور ایرانی سمگلر شامل ہیں۔ ایرانی سمگلروں کو اپنے پاسداران کی حمایت حاصل ہے اور کُردوں کو اپنی تنظیم پیش مرگہ کی۔ یہ سارے ملیشیا کے لوگ ایک چیک پوائنٹ پر دولت اسلامیہ کے سپاہیوں سے جنگ میں مصروف ہوتے ہیں اور دوسرے چیک پوائنٹ پر ان کا تیل خرید رہے ہوتے ہیں۔ وہ تمام حکومتیں جو چیخ چیخ کر داعش کو دہشت گرد کہہ رہی ہیں انہی کی زمین پر اس کا تیل خریدنے اور انہیں سرمایہ فراہم کرنے کیلئے استعمال ہو رہی ہے۔

دوسری منافقت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب جس کے لئے دولت اسلامیہ کو سب سے بڑا خطرہ تصور کیا جارہا ہے۔ پوری دنیا میں یہ پراپیگنڈہ عام کیا جارہا ہے کہ مسلم ممالک میں دہشت گردی اور شدت پسندی کی وجوہات میں معاشی ناہمواری' جمہوریت کا فقدان' سکولوں کے نصاب تعلیم جو جہاد کا درس دیتے ہیں اور سخت متعصبانہ قوانین ہیں۔ ان وجوہات کی وجہ سے شدت پسندی کو فروغ مل رہا ہے۔ پورا مغرب مسلمان ملکوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ اپنا نصاب سیکولر کرو' اپنی حکومتیں جمہوری بناؤ' اپنے پسماندہ لوگوں کو معاشی طور پر مستحکم کرو' اپنی خواتین کو برابری کے حقوق دو۔ اگر تم یہ سب کر لو گے تو تمہارے اندر سے دہشت گردی اور شدت پسندی ختم ہو جائے گی۔ ان کی بولی بولنے والی ہزاروں این جی اوز اور ان عالمی طاقتوں کی امداد کے لالچ میں دیوانے ہوئے حکمران روزان اقدامات کارونا روتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور میڈیا میں "دانشوروں" کے مضامین اور گفتگو صرف چند باتوں پر مرکوز ہے' نظام تعلیم سے مذہب نکالو' مدرسوں کو ٹھیک کرو' عورتوں کو میدان عمل میں لاؤ' دہشت گردی کا یہی توڑ ہے۔ لیکن کوئی اس بات کا جواب نہیں دے پاتا کہ گزشتہ ایک سو سال کی انسانی جنگوں میں کسی اور جنگ میں اس جوق در جوق رضاکارانہ طور پر اتنے جہادی نہیں گئے جتنے عراق اور شام میں دولت اسلامیہ کے لئے لڑنے گئے ہیں۔ افغانستان میں بھی جتنے بنائے گئے' تنظیمیں بنیں' ان کو امریکہ اور دیگر حواریوں نے مدد فراہم کی' ویت نام میں بھی چین اور روس کی مدد شامل تھی۔ لیکن یہاں سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بیرونی ملک سے لڑنے کے لئے جانے والوں میں اکثریت یورپی ممالک کے افراد کی ہے۔ وہ مغربی ممالک جہاں یہ سب پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسے ممالک جہاں سیکولر نظام تعلیم رائج ہے' جمہوریت بھی مستحکم ہے' معاشی ناہمواری بھی نہیں' وہاں تو کوئی مدرسہ بھی قائم نہیں ہے پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنی پر آسائش زندگیاں چھوڑ کر شام اور عراق میں لڑنے جارہے ہیں۔ داعش کے آغاز میں یعنی آج سے چھ ماہ قبل 30 اگست 2014 کو "اکانومسٹ" نے ان افراد کی تعداد بتائی تھی جو یورپی ممالک سے لڑنے عراق اور شام گئے ہیں۔ جریدے کے مطابق بیلجیم سے 250' ڈنمارک سے 100' فرانس سے 700' آسٹریلیا سے 250' ناروے سے 50' ہالینڈ سے 120' آسٹریا سے 60' آئرلینڈ سے 30' برطانیہ سے 400' جرمنی سے 270 اور امریکہ سے 70 افراد اپنی پر تعیش زندگی چھوڑ کر شام چلے گئے۔ اس وقت ان کی تعداد کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ دنیا کی اب تک ہونے والی جنگوں میں کسی بھی جنگ میں یورپ سے اس قدر تعداد رضاکار جنگجوؤں کی روانہ نہیں ہوئی اور نہ ہی اس قدر زیادہ ملکوں سے لوگ کسی ایک جگہ لڑنے گئے ہیں۔ یورپی ممالک سے ایسے جہاد مارچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ مغربی ملک کونسا مدرسہ بند کریں گے اور کونسا نصاب تعلیم تبدیل کریں گے اور عورتوں کو اور کتنے زیادہ حقوق دیں گے کہ شدت پسندی کم ہو۔ یہ سب جنگ پراپیگنڈے سے جیتنا چاہتے ہیں۔ لیکن دسمبر کے آخری ہفتے میں جرمنی کے صحافی جو رگن ٹوڈن ہومز نے برطانوی اخبار Independent میں اپنے دولت اسلامیہ کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ یہ 74 سال جرمن صحافی واحد مغربی صحافی ہے جو اب تک وہاں پہنچا ہے۔ اس کے انکشافات ایسے ہیں کہ جو مغرب کے لئے کڑوی گولیاں سمجھی جارہی ہیں۔ انہیں پہلے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے سیکولر معاشرے سے اس قدر جہادی کیسے پیدا ہو سکتے ہیں' اب وہ ٹوڈن ہومز کی اس بات پر کیسے یقین کر لیں جو اس نے سی این این پر انٹرویو دیتے ہوئے کہی ہے۔ اس نے کہا کہ "وہ وقت دور نہیں جب داعش مغرب کے ساتھ بقائے باہمی کے لئے مذاکرات کرے گی اور مغرب کو دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہو گا"۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے' سوچنے کی گھڑی ہے۔ مغرب شاید سوچ رہا ہے کہ شدت پسندی اور دہشت گردی ہماری پالیسیوں اور طاقت کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے لیکن اس نے بندوق ہمارے ہاتھ میں پکڑا دی ہے۔ خون بھی ہماری زمینوں پر بہتا ہے اور شدت پسندی بھی یہاں جنم لیتی ہے۔ ہم کب تک قتل کرنے اور قتل ہوتے رہیں گے۔ چند لمحوں کے لئے اپنے مسلک' اپنی نسل' اپنے عقیدے اور اپنی تعلیم کے تعصب کو پس پشت ڈال کر سوچئے ضرور۔ صرف چند لمحوں کے لئے۔

جدید سیکولر نظامِ تعلیم کی تاریکیاں

جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے تحت پوری دنیا میں اس وقت جتنے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں، اگر ان کی تعداد کا شمار کیا جائے تو یوں لگے گا جیسے آج کا دور صرف اور صرف انسانوں کو علم بانٹنے کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ اس علم کی روشنی سے جو انسان برآمد ہو رہے ہیں انہوں نے اپنے اردگرد ایک چکا چوند انسانی بستی آباد کر لی ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں پُر آسائش گھر ہیں، تیز رفتار گاڑیاں، ٹرینیں اور جہاز ہیں، آسمان کو چھوتی عمارتیں ہیں، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، غرض آسائش کا ہر سامان میسر ہے۔ بیماری کے علاج کے لیے ہسپتال اور ہمہ وقت مستعد صحت کا عملہ ہے، صاف پانی، بجلی، گیس اور دیگر سہولیات بہم پہنچانے کے لیے ایک شاندار خدماتی نظام کار موجود ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ دن رات مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں اس دھن میں مگن رہتے ہیں کہ نئی سے نئی چیز مارکیٹ میں لائی جائے جس کو لوگ پسند کریں۔ ان تمام تر آسائشوں اور مادی سہولتوں کے باوجود آج کا انسان انسانی تاریخ کا سب سے غیر مطمئن اور ناآسودہ انسان ہے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں اس نے جو بھی علم سیکھا اور اس دنیا میں جو معراج حاصل کی اس نے اس کی مادی زندگی کو تو پُر آسائش بنایا لیکن اس کی روح کو بے منزل، بے راہ رو اور بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بے منزل اور بے سکون انسان کے درد کا مداوا موجودہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے کسی بھی سبق میں موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ نفسیات کا مضمون ہے اور وہ بھی شعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں سے ہوتا ہوا بالآخر چند سکون بخش ادویات یا جسم کی اینٹ ھین دور کرنے والی ورزشوں پر ختم ہو جوتا ہے۔ کتھارسس، یعنی دل کی بھڑاس نکالنا ہی علاج کا بہترین ذریعہ ہے اور مادی دنیا کی طرف کارآمد طور پر لوٹ جانا دماغی صحت کی علامت سمجھتا جاتا ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابوں پر مشتمل جدید سیکولر نظامِ تعلیم میں انسان کی روح کے متعلق مبلغ علم کی یہ کل کائنات ہے۔ اخلاقیات، معاشرت، انسانی رشتے، تہذیبی اقدار اور ذہنی سکون، یہ سب کے اس جدید سیکولر نظامِ تعلیم میں دو اور دو چار کی طرح معاشرے میں ہونے والی کاروباری، معاشی اور سیاسی ترقی یا تبدیلی کے ساتھ منسلک کر دیئے گئے ہیں۔ اسی لیے جدید تعلیمی نظام کا موضوع انسان نہیں بلکہ اس کا موضوع مادی ترقی اور دولت کا حصول ہے۔

جب سے یہ دنیا تخلیق ہوئی ہے، انسانی تاریخ نے تقریباً دو درجن کے قریب مختلف تہذیبیں دیکھی ہیں جو بامِ عروج پر پہنچیں۔ ان تمام تہذیبوں نے ترقی کے اعلیٰ ترین معیار قائم کئے اور ان کے نقوش آج بھی زمین کے سینے پر ثبت ہیں۔ مصر، چین، بابل، یونان ایران، سندھ اور دیگر تہذیبوں نے علم و فن میں جو ترقی حاصل کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان تمام تہذیبوں نے علم سیکھنے اور سکھانے کے لیے ادارے بھی قائم کئے۔ لیکن کسی بھی تہذیب کے تعلیمی اداروں کا بنیادی مقصد موجودہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کی طرح مادہ پرستی اور شکم و شہوت پرستی نہیں تھا۔ ہر تہذیب نے اپنے علمی اداروں میں اعلیٰ ترین اخلاقی معیارات سکھانے اور صرف اور صرف علم حاصل کرنے کے بلند ترین مقصد کو آگے رکھا۔ لیکن جدید سیکولر تعلیمی نظام کا اولین اور بنیادی مقصد روٹی کمانا ہے۔ علم، حقیقت اور کائنات کے رازوں سے آگاہی ہرگز نہیں۔ اسی لیئے موجودہ نظامِ تعلیم ڈگری یا سند کے حصول کے گرد گھومتا ہے اور ہر یونیورسٹی کی ڈگری یا سند کی مارکیٹ میں الگ الگ قیمت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ تصور کرتا ہے کہ پورا نظامِ علم کی اعلیٰ ترین اقدار اور اس کے حصول پر قائم ہے تو اس سے بڑا مذاق کوئی نہیں۔ اگر دنیا بھر کی حکومتیں یا کارپوریٹ سرمایہ دار یہ اعلان کر دیں کہ ہم یونیورسٹی سے حاصل ہونے والی ڈگریوں یا اسناد پر لوگوں کو ملازمت نہیں دیں گی تو صرف چند ماہ کے اندر یہ تمام تعلیمی ادارے ویران ہو جائیں اور علم کے حصول کے دھوکے میں آباد کی گئی یہ تمام بستیاں تباہ و برباد ہو جائیں۔

یہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور کیوں ہماری ضرورت بنا دیا گیا ہے؟۔ اس تعلیم کو نوکری یا پیسہ کمانے کے ساتھ وابستہ کر کے ہمیں وہ تمام تہذیبی اور ثقافتی اقدار بھی پڑھائی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں ہم بچپن ہی سے مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ دس سال کی عمر تک بچہ اپنے دماغ کی دیوار پر ایک اجنبی ماحول کے نقوش بناتا ہے اور یہ نقوش دائمی ہوتے ہیں۔ اس نظامِ تعلیم میں پڑھنے والا بچہ سنڈریلا، سانتا کلاز، سنو وائٹ اور انگوروں کی فصل پکنے پر شراب کشید کرنے کے گیت اس کے دماغ پر نقش ہوتے ہیں۔ ابتدائی کلاسوں میں پڑھائی جانے والی تمام کتابوں میں جو ثقافت اور تہذیب ان کو ازبر کروائی جاتی ہے اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، چکی کی گھر گھر اور صحراؤں کی بانسری کی آواز سے کوئی رغبت نہیں رہتی بلکہ وہ ان سب کو ایک کمترین اور کمزور درجے کی تہذیب سمجھ کر مسترد کر دیتا ہے۔ اس پورے تعلیمی نظام کا بنیادی مقصد صرف اور صرف ایک "یک رخا" آدمی (Onedimensionalman) پیدا کرنا ہے جو خالصتاً مغربی کارپوریٹ تہذیب کا وفادار ہو۔ وہ اس کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی تنقید یا نقائص ڈھونڈنے کے لیے عقل استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کا دفاع کرتا ہے اور جذباتی طور پر کرتا ہے۔ جبکہ اپنی ساری منطق اور سارا علم دین کی تنقید اور اس میں نقائص ڈھونڈنے میں لگاتا ہے۔

یہ جدید سیکولر تعلیمی نظام جس تہذیب کا اسے غلام بناتا ہے وہ تین چیزوں کی مرکب ہے، سیکولرازم، سرمایہ داری اور جمہوریت۔ ان تینوں تصورات سے جس تہذیب نے جنم لیا ہے وہاں انسانی ترقی کا معیار علم یا سائنس نہیں بلکہ وہ کام، فن یا علم ہے جس سے سرمایہ حاصل کیا جا سکے۔ ایسی تمام محنت جس سے دولت حاصل نہیں ہوتی وہ اس تہذیب میں قابلِ عزت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں ایک عورت جو گھر میں چوبیس گھنٹے بچوں کو پالتی اور اس گھر کو اپنی محنت سے جنت کا نمونہ بناتی ہے اس کی کوئی عزت یا حقوق نہیں جبکہ بازار میں کھڑے ہو کر جسم بیچنے والی عورت کو عزت کے لفظ "سیکس ورکر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی فلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اس جدید سیکولر تعلیمی نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی کام کرنے والے، سائنس دان یا دیگر فنون سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے شوق سے یہ کام کرنا چاہیں تو کریں ورنہ معاشرتی طور پر تو عزت اسی علم اور اسی ڈگری کی ہے جسے مارکیٹ میں بیچ کر سرمایہ حاصل کیا جا سکے۔ اس جدید مغربی تہذیب کا کمال یہ ہے کہ سرمایہ اور عزت کمانے کے لیے بعض اوقات نہیں بلکہ اکثر اوقات آپ کو علم، ڈگری اور سند کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں فٹ بال کا کوچ برکلے یا کسی بھی بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے سو گنا زیادہ کماتا ہے۔ سٹے بازی سے زیادہ سرمایہ کہیں نہیں ہے۔ عریانی و فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ کما لیتی ہے دنیا کی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی بھی نہیں کما سکتی۔ آج کے دور کی مغربی سیکولر تہذیب کے سب سے بڑے مفکر جان رالز نے اپنی کتاب (justice

کے لیے بعض اوقات نہیں بلکہ اکثر اوقات آپ کو علم، ڈگری اور سند کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں فٹ بال کا کوچ برکلے یا کسی بھی بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے سو گنا زیادہ کماتا ہے۔ سٹے بازی سے زیادہ سرمایہ کہیں نہیں ہے۔ عریانی و فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ کما لیتی ہے دنیا کی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی بھی نہیں کما سکتی۔ آج کے دور کی مغربی سیکولر تہذیب کے سب سے بڑے مفکر جان رالز نے اپنی کتاب (justice
Theory of) میں اس تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے اور اسے جدید مغربی تہذیب پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ انسان کی زندگی کے صرف چار مقاصد ہیں "آمدنی، دولت، قوت اور اقتدار" یہی چار مقاصد ہیں جو جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں راسخ کرائے جاتے ہیں۔ اسی لیئے اقبال نے کہا تھا۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

ملکہ سباء کی سرزمین اور عرب دنیا کا غریب ترین ملک "یمن" دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ اہم رہا ہے۔ عاشق رسول ﷺ حضرت اویس قرنی کا مسکن اور وہ خطہ جس کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا "بہترین ایمان یمن میں ملے گا اور شاندار حکمت بھی وہاں کی"۔ احادیث کی تمام کتب میں جہاں کہیں قیامت کے قرب میں دور فتن کا تذکرہ ہے وہاں ہادی برحق ﷺ نے دو خطوں کو بہت اہمیت دی ہے' ایک شام اور دوسرا یمن۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے اللہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما' اے اللہ ہمارے یمن میں برکت عطا فرما' لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارے نجد میں بھی' آپ نے فرمایا' اے اللہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں بھی۔ لوگوں نے پھر کہا ہمارے نجد میں بھی' راوی کا کہنا ہے کہ میرا خیال ہے تیسری بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں زلزلے آئیں گے اور فتنے ہوں گے اور وہاں شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا۔ (بخاری' مسند احمد)۔ شام تو گزشتہ تین سالوں سے اس جنگ میں داخل ہو چکا ہے جس کا تذکرہ کتب احادیث میں ملتا ہے اور اب یمن نے انگڑائی لے لی ہے۔ ایک حیران کن ترتیب زمانی ہے جو ہو بہو ویسی ہی ظہور پذیر ہوتی جا رہی ہے جیسی کتب احادیث میں بتائی گئی ہے۔ سب سے پہلے عراق کی جنگ ہے اور اس کے نتائج سے دوسری جنگیں نکل رہی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ وہ وقت قریب ہے جب بنو ق نطورا یعنی اہل مغرب تمہیں عراق سے نکال دیں گے' میں نے پوچھا ہم دوبارہ واپس آ سکیں گے' حضرت عبداللہ نے فرمایا' آپ ایسا چاہتے ہیں' میں نے کہا ضرور' انہوں نے فرمایا ہاں عراق واپس لوٹ آئیں گے اور ان کے لئے خوشحال اور آسودگی کی زندگی ہوگی (الفتن۔ نعیم بن حماد)۔ اسی جنگ کے بارے میں ایک اور روایت' آپ ﷺ نے فرمایا' قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک فرات سے سونے کا پہاڑ نہ نکلے' لوگ اس پر جنگ کریں گے اور ہر سو میں سے ننانوے مارے جائیں گے۔ ہر بچنے والا سمجھے گا کہ شاید میں ہی اکیلا بچا ہوں (مسلم)۔ عراق پر جنگ جس طرح مسلط کی گئی اور جس طرح تمام اہل مغرب نے مل کر وہاں کی ہر بستی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انہیں ہجرت پر مجبور کیا' اس کی کہانی بار بار بیان ہو چکی۔ اس کے بعد کی ترتیب کے مطابق' مصر میں انتشار اور خرابی کا ذکر ہے اور ٹھیک اسی ترتیب سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ حضرت وہب ابن منبہ فرماتے ہیں کہ جزیرۃ العرب اس وقت تک خراب نہ ہوگا جب تک مصر خراب نہ ہو جائے (السنن الواردہ فی الفتن)۔ حضرت اسحٰق ابن ابی یحییٰ الکعبی حضرت اوزاعی سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ جب پیلے جھنڈوں والے مصر میں داخل ہو جائیں تو اہل شام کو زمین دوز سرنگیں کھود لینی چاہئیں (السنن الواردۃ فی الفتن)۔ مصر ہی عرب بہار میں سب سے پہلے متحرک ہونے والے ملکوں میں سے تھا۔ وہاں سے حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ التحریر اسکوائر کے اجتماعات کے بعد ہوا۔ پیلے جھنڈے وجود میں آئے جن پر چار انگلیوں کے نشان تھے' اخوان المسلمون کی حکومت بنی اور پھر دوبارہ وہاں جنرل سیسی کے ذریعے آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ یہی دور تھا جب شام کے صدر بشار الاسد نے اپنے خلاف بغاوت کو کچلنے کے لئے بے دریغ قتل عام شروع کیا اور طیاروں سے بمباری شروع کی جس سے اس وقت تک اندازاً چار لاکھ کے قریب لوگ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ کس قدر اہم ہدایت دی گئی تھی اس حدیث میں کہ شام کے لوگوں کو زمین دوز سرنگیں کھود لینی چاہئیں۔ شام آخری جنگ میں جسے رسول اللہ ﷺ نے ملحمۃ الکبریٰ کہا ہے مسلمانوں کا ہیڈ کوارٹر ہوگا اور اسی جگہ مغرب سے جنگ برپا ہوگی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی نصرت یمن سے کی جائے گی۔ حضرت کعب سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "جب رومی جنگ عظیم (ملاحم) میں اہل شام سے جنگ کریں گے تو اللہ تعالیٰ دو لشکروں کے ذریعے اہل شام کی مدد کرے گا۔ ایک مرتبہ ستر ہزار سے اور دوسری مرتبہ اسی ہزار' اہل یمن کے ذریعے' جو اپنی بند تلواریں لٹکائے ہوئے آئیں گے۔ وہ کہتے ہوں گے کہ ہم پکے سچے اللہ کے بندے ہیں۔ ہم اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے طاعون' ہر قسم کی تکلیف اور تھکاوٹ اٹھا لیں گے (الفتن' نعیم بن حماد)۔ مغرب کی طاقتوں سے یہ جنگ اعماق اور دابق کے مقام پر لڑی جائے گی۔ یہ دونوں قصبے شام کے شہر حلب سے پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ترکی کے قریب ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے "اہل روم اعماق اور دابق کے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ ان کی طرف ایک لشکر مدینہ سے پیش قدمی کرے گا جو اس زمانے کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوں گے تو رومی کہیں گے تم ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جو ہمارے لوگوں کو قید کر کے لائے ہو' ہم انہی لوگوں سے جنگ کریں گے' مسلمان کہیں گے نہیں اللہ کی قسم ہم ہرگز تمہارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہیں ہٹیں گے۔ اس پر تم ان سے جنگ کرو گے۔ اب ایک تہائی مسلمان بھاگ کھڑے ہوں گے جن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہیں کرے گا' ایک تہائی شہید کر دیئے جائیں گے' باقی ایک تہائی فتح حاصل کریں گے (مسلم' ابن حبان) سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے آثار کس قدر واضح نظر آ رہے ہیں۔ پورا مغرب شام میں جنگ کرنے کے لیے متحد ہو رہا ہے اور بہانہ وہی لگایا جا رہا ہے کہ ہمارے یورپ کے لوگ قید کر کے لائے گئے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے لڑیں گے، لیکن اگر جنگ شروع ہو گئی تو پھر اہل مغرب کے مقابلے میں سب مسلمان متحد ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں انتظار میں تھا کہ کب یمن میں امریکہ کی قائم کردہ پٹھو حکومت ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس آخری جنگ میں شام کی نصرت میں یمن سے بھی لوگ جائیں گے اور خراسان کے سیاہ جھنڈوں والے تو پہلے ہی افغانستان میں امریکہ کو شکست فاش دے چکے۔ اب تو بس اتحادی فوجیوں کی جانب سے جنگ کا نقارہ بجنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھیں امت کس طرح ایک جگہ اکٹھی ہوگی اور اس کا ذکر ہادی برحق صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وضاحت سے کر دیا ہے۔

یمن وہ سرزمین ہے جہاں سیدنا علی بن حسینؓ جنہیں امام زین العابدین کہا جاتا ہے ان کے فرزند ارجمند حضرت زید بن علیؒ کے ماننے والے زیدیہ فرقے کے افراد مقیم ہیں۔ حضرت زید بن علیؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اموی حکمران کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ وہ کوفہ پہنچے تو کوفہ والوں نے ان کے ساتھ وہی کیا جو ان کے دادا سیدنا امام حسینؓ اور مسلم بن عقیلؓ کے ساتھ کیا تھا۔ چالیس ہزار افراد نے ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کی بیعت کی' لیکن جب وقت آیا تو وہ سب اکٹھے ہو کر آئے اور پوچھا' تم کس چیز کی دعوت دیتے ہو، فرمایا اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کیا جائے۔ اس پر ان لوگوں نے سوال اٹھایا ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صحبت میں انہوں نے زندگی گزاری اور میں نے اپنے گھر والوں سے ان کا ذکر ہمیشہ خیر اور بھلائی سے سنا۔ یہ سننا تھا کہ وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ جب زید بن علیؒ جہاد کے لیے علم بلند کر رہے تھے تو امام ابو حنیفہؒ نے ان کے بارے میں کہا تھا "زید کا اس وقت اٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بدر میں تشریف آوری کے مشابہ ہے"۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول کس قدر درست ثابت ہوا کہ زید بن علیؒ جب خروج کے لیے نکلے تو ان کے ساتھ بھی تین سو تیرہ افراد تھے۔ وہی تعداد جتنی بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ تھی۔ حضرت زید بن علی کے ماننے والے زیدیہ کہلاتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد کو حضرت زید کے اس خطبے سے اخذ کرتے ہیں۔ "میں ان لوگوں سے بری ہوں جو اللہ کو مخلوق جیسی ہستی سمجھتے ہیں اور ان جبریوں سے بھی بری جو اپنی ساری بداعمالیوں کی گٹھڑی اللہ پر لاد کر کہتے ہیں کہ سب اللہ کرتا اور کراتا ہے اور ان لوگوں سے بھی بری جنہوں نے بدکاروں کے دلوں میں یہ امید پیدا کر دی ہے کہ خدا انہیں یوں ہی چھوڑ دے گا اور میں ان دین باختوں سے بھی بری جو حضرت علیؓ کو دین سے خارج اور ان رافضیوں سے بھی جدا جو ابو بکرؓ اور عمرؓ کی تکفیر کرتے ہیں۔" یہی ہے ایک امت کا عقیدہ' اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا بہترین ایمان یمن میں ملے گا۔ "یہ لوگ اس طوق غلامی کو اتار پھینکیں گے جو امریکہ اور اس کے حواریوں نے انہیں پہنایا تھا۔ حالات کی ترتیب تو ویسی ہی ہے جیسی احادیث میں رقم ہے لیکن دیکھنا صرف یہ ہے کہ کب مغرب یلغار کرتا ہے اور پھر کب یہ امت ایک ہو جاتی ہے۔

DAILY EXPRESS
روزنامہ ایکسپریس

عالمی جنگ یا معرکۂ حق و باطل

چاروں جانب ایک افراتفری ہے، حالات میں ایک تیزی ہے، ایسے لگتا ہے دنیا پر حکمران طاقتیں جلد از جلد بہت سے کام کرنا چاہ رہی ہیں۔ اتنے محاذ تو پہلے کبھی نہ کھولے گئے تھے۔ دنیا میں دو عالمی جنگیں ہوئیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ملک اس میں شامل ہوتے گئے اور جنگ کے شعلے پھیلتے گئے۔ لیکن اس وقت تو ایسے لگتا ہے جیسے ہندوؤں کے دیوتا ہنومان کی طرح جس نے اپنی دم میں آگ باندھی تھی اور دم کو گھما کر راون کی ساری سلطنت لنکا کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ ایسے حکمران کئی ہنومان ہیں جو اپنی دموں میں آگ باندھ کر انہیں لہرائے جا رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ سال سے اس دنیا کو آگ اور خون میں نہلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ 2008 میں جب سودی معیشت کا بلبلہ پھٹا تو عالمی سطح پر ایک ایسا بحران آیا کہ بڑی بڑی معیشتیں اور عالمی طاقتیں چیخ اٹھیں۔ وہ وال سٹریٹ جو کبھی حکومتوں کو خریدا کرتی تھی، اس نے امریکی حکومت سے اپنی زندگی کی بھیگ مانگ لی۔ فرمائش کی گئی کہ لوگوں کے پیسوں سے سات سو ارب ڈالر اسے دے دیئے جائیں تو وہ سنبھل سکتی ہے۔ بینکوں کی سود کمانے کی خواہش دم توڑ گئیں اور شرح سود صفر تک جا پہنچی۔ ایسے میں زوال کھاتی معیشت اور افغانستان و عراق میں شکست کھاتی فوجی قوت نے Rand کارپوریشن کو ایک ذمہ داری سونپی۔ اسے صرف ایک سوال دیا گیا کہ اس بحران سے کیسے نکلا جائے۔ تجویز بھی صرف ایک ہی دی گئی، اور وہ یہ کہ ایک بہت بڑی عالمی جنگ ہی امریکی معیشت کو چار چاند لگا سکتی ہے۔ میدانِ جنگ پہلے سے گرم ہے، بس ذرا اس کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ افغانستان اور عراق کے ساتھ جنگ کو دو ملکوں کے ساتھ جنگ بنا کر نہیں پیش کیا گیا تھا بلکہ دہشت گردی کے خلاف ایک عالمی جنگ کہا گیا تھا۔ اگرچہ جنگ کرنے والوں نے دہشت گردی اور شدت پسندی کے ساتھ کبھی اسلام کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن اس جنگ میں قتل صرف اور صرف لاکھوں مسلمان ہی کیے گئے۔ رینڈ کارپوریشن نے یہ مشورہ دیا کہ اس جنگ کو پھیلا دو۔ تین ملک ایسے ہیں جن کی معیشت مضبوط ہے، جنگوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ بھارت، چین اور روس۔ تینوں ممالک میں کروڑوں کے حساب سے مسلمان بستے ہیں۔ لیکن ان ملکوں کے ساتھ اس جنگ کو لڑے گا کون؟۔ تجویز دی گئی کہ دو ملک ایسے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا افغانستان۔ ایک ملک میں عسکری اور انتظامی صلاحیت ہے اور دوسرے میں دیوانوں، فرزانوں اور جہادیوں کی کمی نہیں۔ 2010 کے آغاز میں اس تجویز کو سرکاری پالیسی کا حصہ بنایا گیا اور پھر دو اعلان سامنے آئے، ایک یہ کہ امریکی اور اتحادی افغانستان سے چلے جائیں گے اور دوسرا یہ کہ اگلے دس سال امریکہ اپنا سرمایہ اور وقت بحر ہند اور بحرالکاہل کے ممالک میں صرف کرے گا جو فلپائن سے لے کر برما تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سے پاکستان اب عالمی سفارت خانوں میں انڈوپاک ریجن کے طور پر نہیں جانا جاتا بلکہ افغان پاک ریجن ہو چکا ہے۔ اس ریجن یا علاقے میں ایسی حکومتوں کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے جو خطے کے تینوں ممالک میں پھیلے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکیں اور ایک نہ ختم ہونے والے جنگ شروع کریں جس سے روس، چین اور بھارت متاثر ہوں اور وہ اسلحہ اور دیگر سہولیات کیلئے سات سمندر پار امریکہ کے محتاج ہو جائیں۔ ان ممالک میں لڑنے والے مسلمانوں کو بھی اسلحہ فراہم کرنے والے امریکی اسلحہ ساز فیکٹریوں سے اسلحہ خریدیں اور یوں امریکہ کا ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس رات دن ترقی کرنے لگے۔ جس سال یہ رپورٹ منظر عام پر آئی، دو ملکوں نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا۔ ایک چین اور دوسرا فرانس لیکن میڈیا پر مخصوص قبضے کی وجہ سے یہ دونوں احتجاج دب کر رہ گئے۔

چند سال پہلے یہ رپورٹ فقط ایک تجویز نظر آتی تھی جس کے کچھ حصے منظر عام پر آئے تھے، لیکن آج یوں لگتا ہے اس پر مکمل عمل درآمد ہونے والا ہے اور ایک بہت بڑے سٹیج کے لیے تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں۔ ایک بہت بڑی عالمی جنگ کا سٹیج۔ عرب دنیا میں گذشتہ چند سالوں سے جو عرب بہار کے نام تحریکیں برپا ہوئیں اور پھر ان کے انجام نے جس افراتفری نے جنم لیا اس نے پورے خطے میں اسلحے کی دوڑ کو تیز کر دیا۔ شام، عراق، لیبیا، سودی عرب، یمن، بحرین، نائجیریا، صومالیہ، ہر طرف بندوقیں تنی ہوئیں ہیں، اور ان ملکوں میں سے کوئی بھی اسلحہ نہیں بناتا، سب امریکہ اور حواریوں سے خریدتے ہیں۔ روس کے ساتھ مغرب کے تعلقات بہتر تھے اور مغربی طاقتیں بھی اس کی بہت عرصہ ناز برداری کرتی رہیں۔ لیکن اب یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ آج سے صرف چند سال پہلے اگر کسی کو یہ بتایا جاتا کہ امریکہ کے علاقے ٹیکساس اور اوکلوہاما میں موجود تیل کے ذخائر کو مارکیٹ میں لے آیا جائے گا جنہیں Shale آئل کہتے ہیں، تو کوئی یقین تک نہ کرتا۔ کیونکہ اس تیل کو زمین سے نکالنے میں اسقدر لاگت آتی ہے کہ اگر تیل ستر ڈالر فی بیرل نہ بکے تو نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ جنگ میں مخالفین کو مالی طور پر کمزور کرنے اور اتحادیوں کے سرمائے میں اضافے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے امریکہ اب تیل پیدا کرنے والا سب بڑا ملک بن چکا ہے۔ تیل کی قیمتیں گرنے سے جو کچھ ہوا، اس سے آئندہ کے منظر نامے کا پتہ چلتا ہے۔ بھارت ہر سال تیل پر دس ارب ڈالر کی سبسڈی دیتا ہے اب یہ اس کی بچت ہے۔ چین کا معاملہ یہ ہے کہ اگر تیل کی قیمتوں میں ایک ڈالر کی کمی ہوتی ہے تو اس کی بچت میں 2 ارب ڈالر کا اضافہ ہوگا۔ امریکہ میں ہر شہری کی بچت دو گنی ہو جائے گی۔ لیکن روس، ایران، وینزویلا اور سعودی عرب کی معیشتیں خطرات کا شکار ہوں گی۔ ان میں سعودی عرب خطرے سے سنبھل سکتی ہے لیکن روس کا روبل تو بری طرح اپنی قیمت کھو چکا ہے۔ ایران کو اپنی معیشت بچانے کیلئے امریکہ اور مغربی طاقتوں سے اتحاد کرنا پڑ رہا ہے تاکہ پابندیاں ختم ہوں اور وینزویلا تو شاید دیوالیہ ہو جائے۔ تیل سے پیدا ہونے والے اس بحران میں جنگوں کی آگ بھی سلگنے لگی ہے۔ چین اور بھارت دو حکومتیں سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ہنومان اپنی دم میں آگ باندھ کر بھارت پہنچ گیا ہے۔ ساری بچت اسلحے کی خریداری پر خرچ ہوگی۔ دوسری جانب پاکستان کا خوف اسے چین لے گیا ہے اور چین کا خوف اسے یاد دلا رہا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی تو اس کے خلاف پانچ سال سے چل رہی ہے۔ لیکن چین کی تاریخ تو تجارت سے بھری پڑی ہے، لڑائی سے اسکا دور کا واسطہ نہیں، بس دیوار چین بناؤ اور خود کو محفوظ کر لو۔ امریکہ کے ساحلوں سے لے کر ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور دیگر ممالک میں چند فیصد چینی بستے ہیں جو نوے فیصد سے زیادہ کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ فرانس نے ذرا سا اس جنگ سے باہر ہونے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے ہی تھے کہ کارٹونوں کے واقعہ کے بعد پورے یورپ کو وہاں اکٹھا کر دیا گیا۔ یورپ کیوں نہ اکٹھا ہوتا، جس دولتِ اسلامیہ سے جنگ کا میدان سجایا جا رہا ہے۔ اس میں یورپ کے ممالک کے مسلمان لڑنے جا رہے ہیں اور تشویش کا عالم یہ ہے کہ وہاں پر بسنے والے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی شدت پسند اور دہشت گرد کہا جا رہا ہے۔ جرمنی کی چانسلر نے جب یہ کہا کہ اسلام کا تعلق جرمنی سے بھی ہے تو DEGIDA تحریک پچیس ہزار افراد کو سڑکوں پر لے آئی اور نعرہ یہ تھا کہ یورپ اور اسلام دو مختلف نام ہیں۔ تمام سٹیج سج چکا ہے اور اب لبنان کے قریب اسرائیل کے سپاہیوں پر میزائل سے حملہ ایک بار پھر حزب اللہ اسرائیل جنگ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ دبئی میں سرمایہ کاری شروع ہوئی تو سب نے مل کر سوچا کہ کونسا شہر ایسا ہے جو دبئی کی اس سرمایہ کاری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ بیروت ہے۔ عربوں کی عیاشی کا سب سامان بھی موجود ہے اور زبان کا مسئلہ بھی نہیں۔ پھر کیا تھا دو سرائیلی سپاہی حزب اللہ کے قبضے میں آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ حزب اللہ کے سب ٹھکانے تو محفوظ رہے جو اسرائیل کی سرحد پر واقع تھے، حسن نصر اللہ بھی ہزاروں لوگوں کی ریلیاں بھی کرتا رہا، کوئی القاعدہ یا طالبان ہوتا تو ڈرون سے اڑا دیا جاتا، لیکن بیروت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ حالانکہ بیروت شہر میں تو عام شہری رہتے تھے۔ اسرائیل کو ایک بار پھر اس جنگ میں براہ راست دھکیلنے کا مقصد شام اور عراق میں جنگ کے شعلوں کو بھڑکانا ہے۔ بشارالاسد پر حملہ ہو یا دولتِ اسلامیہ پر دونوں صورت اسرائیل کی خوشی۔ کیا یہ صرف ایک عالمی جنگ کا آغاز ہوگا یا آخری معرکۂ حق و باطل۔ ہر کسی کا ایمان اسے روشنی دکھا سکتا ہے۔

نوٹ: ایک ڈرائیور کے دو بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے پرائیوٹ کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ اسے فیس کا مسئلہ ہے کوئی صاحب براہ راست فیس جمع کروا سکتے ہوں تو اس نمبر پر اس سے رابطہ کر لیں۔ 03004613521 فیس براہ راست ادارے میں جمع کروائیں۔